ڈیرہ

BALOCH LIBERATION ARMY
B.L.A
STRUGGLE TILL VICTORY

ڈیوا
اشاعت:13نومبر2025
ہکل پبلیکیشنز- بلوچ لبریشن آرمی

پیش لفظ

انسانی شناخت و تشخص کی تاریخ کے اوراق یہ واضح کرتے ہیں کہ اقوام کی بنیاد فقط زمین نہیں، بلکہ مقصد اور منزل پانے کی جستجو و عمل میں نچھاور کی گئی جانیں، خون و خید اور خواب ہوتے ہیں جو اُن کی پائندگی کی سنگِ بنیاد بنتے ہیں۔ یہ وہ پروانے ہیں جو آگِ آزادی کی روشنی کے لیے اپنا سب کچھ تیاگ کر مٹتے نہیں، بلکہ روشنی میں جذب ہو کر راہِ جدوجہد کو منور کرتے ہیں۔ اُن کی کہانیاں محض ردوادِ جدوجہد نہیں، بلکہ نسلوں کو ذات کے صحرا میں بھٹکنے سے روکنے والی تاریخ ہیں، اور انہیں ورثے کی تلاش میں مصائب برداشت کرنے کی سکت فراہم کرتی ہیں۔

اُن کرداروں کو یاد کرنا کسی رسم کی پاسداری نہیں، بلکہ اُس عہد کے چراغوں کو ہوا سے بچانے کے مترادف ہے۔ اُن کے مصائب، تکالیف اور قربانیوں کی داستانیں ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ آزادی خواب نہیں، بلکہ امانت ہے جس کی حفاظت افراد نہیں بلکہ نسلوں کو کرنی چاہیے۔ اُن کی کہانیوں کو اپنا نصب العین بنانا اور قربانی کے ورثے کو سرمایہ سمجھنا اقوام کی فکری و نظریاتی پختگی کا آئینہ ہے، جس میں وہ اپنا حال دیکھ سکتے ہیں اور مستقبل کی راہوں کا تعین کر سکتے ہیں۔

جب لوگ ان قربانیوں کے مقاصد بھول جاتے ہیں، تو وہ اپنے مقصدِ حیات سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ اگر آزادی کے جذبے کو صرف رسمی تقریبات یا کھوکھلے الفاظ تک محدود کر دیا جائے تو اس کی روح مر جاتی ہے، اور جذبات میں روح کی عدم موجودگی خوابوں کو حقیقت کی تلاش میں ناکام بنا دیتی ہے۔ شناختی بحران کے صحرا میں بھٹک کر قوم اپنی منزل سے محروم ہو جاتی ہے۔ تب اگر خون کی ندیاں بھی بہائی جائیں تب بھی وہ روشنی پیدا نہیں ہو سکتی جو قبضہ گیریت کے تاریک سائے مٹا سکے۔

ہمیں اس عزم کی تجدید کرنی ہے کہ ہم شہداء کی داستانیں پڑھیں، ان کے نظریات کو سمجھیں اور جدوجہد کو اپنی قومی شناخت کا حصہ بنائیں۔ یہ داستانیں محض ماضی کی یاد نہیں، بلکہ زندہ سبق ہیں جو ہمیں حوصلہ، ایثار اور ایمان کی راہ دکھاتی ہیں۔ ان کے خواب، جدوجہد اور خون ہماری آزادی کی بنیاد ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان کی قربانیوں کو تاریخ کے اوراق تک محدود نہ رکھیں، بلکہ ان کے مشن کو اپنی زندگیوں کا حصہ بنائیں۔ یہی عمل قوموں کو ان کی منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے، وہ منزل جہاں آزادی، وقار اور انصاف ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔

باسط زہری عرف قاضی

عبدالباسط زہری عرف قاضی، 1981 میں خضدار کے نواحی علاقے زہری میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی ہی میں ان کے ذہن نے وہ راستہ چن لیا جو قربانی، ضبط، اور شعور کی راہ تھی۔ 2006 میں بلوچ لبریشن آرمی کی صفوں میں شامل ہو کر انہوں نے اربن گوریلا وار فیئر کو منظم سائنس میں بدل دیا، پھر پہاڑی محاذوں پر اپنی عسکری و فکری بصیرت سے ایک ایسے ادارتی ڈھانچے کی بنیاد رکھی جس نے بی ایل اے کو ایک مربوط مزاحمتی قوت میں ڈھال دیا۔ مگر اس فکری کمانڈر کے پیچھے ایک اذیت ناک خاندانی تاریخ تھی۔ سال 2010 میں ان کے 14 سالہ بھائی مجید زہری، 2011 میں والد محمد رمضان زہری، اور 2012 میں بھائی عبدالحئی زہری عرف نثار شہید کیے گئے۔

سال 2014 میں کزن عبدالصمد زہری عرف شیر ا اور 2018 میں خالہ زاد ضیاالرحمان دلجان زہری شہید ہوئے، جبکہ خالہ زاد راشد حسین کو دبئی سے اغوا کیا گیا جو آج تک لاپتہ ہیں۔ ان تمام صدمات اور قربانیوں کے باوجود باسط زہری کا حوصلہ، عزم اور فکری استقامت پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہوئی، اور وہ اپنے مقصد پر مزید پختگی کے ساتھ ڈٹے رہے۔

بہت سے لوگ انہیں بی ایل اے کے نظریاتی کمانڈر کے طور پر جانتے ہیں، مگر کم لوگ واقف ہیں کہ وہ ایک صاحبِ قلم بھی تھے۔ ان کی چند تحریریں، جو مختلف قلمی ناموں سے شائع ہوئیں، ان کے فکری گہرائی، اخلاقی بصیرت اور سیاسی شعور کو ایک نئے زاویے سے آشکار کرتی ہیں۔

ان تحریروں میں ان کا باطنی اضطراب، قیادت کا تصور، اور جدوجہد کی معنویت نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔

ان کے نزدیک شہادت کوئی محض عقیدہ نہیں، بلکہ علم و آگہی کا آخری درجہ تھی۔

وہ لکھتے ہیں

شہید عظیم ہوتے ہیں، اور اس لیے عظیم ہوتے ہیں کہ وہ ہر قسم کے امتحان سے کامیاب ہو کر گزر چکے ہوتے ہیں۔ ہم ابھی تک ان امتحانات سے نہیں گزرے بلکہ آگے حتیٰ کہ مرتے دم تک ان مراحل کو طے کرنا ہے۔

یہ جملہ صرف جذباتی عقیدت نہیں بلکہ ایک فکری اعتراف ہے، کہ مزاحمت کے راستے پر چلنے والا انسان کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ یہی ناتمامی ان کی قیادت کی اصل روح تھی؛ وہ اپنے سفر کو اختتام نہیں بلکہ مسلسل تربیت اور ارتقا کا عمل سمجھتے تھے۔

ان کی تحریروں میں دکھ ایک اخلاقی توانائی بنکر ابھرتا ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں دل ایک زوردار دھماکے سے پھٹ جائے اور اس کی آواز سے سمندر میں طوفان پیدا ہو جس کی لہریں اپنی بے رحم بانہوں میں اس غم کو سمیٹ کر ہمیشہ کے لیئے مجھ سے بیگانہ کر دیں۔

یہ کوئی شاعرانہ کیفیت نہیں بلکہ وہ فکری اضطراب ہے جو مظلوم کے دل میں آگ بھرتا ہے۔ قاضی کے نزدیک درد تب تک مکمل نہیں ہوتا، جب تک وہ اجتماعی صورت اختیار نہ کرے۔ اسی کیفیت کو وہ ایک اور علامتی فقرے میں یوں بیان کرتے ہیں۔

پہاڑ بیک جنبش لاوے کی شکل اختیار کرلیں، جس کی بہاؤ میں غم والم تپ کر راکھ ہو جائیں۔ یہ ان کا فکری استعارہ ہے، جہاں غم ذاتی نہیں رہتا بلکہ قوم کی آگ بن جاتا ہے۔

ان کے ہاں ایک اور گہرا سیاسی نکتہ یہ ہے کہ وہ مزاحمت کو ریاستی ذہنیت کے خلاف علم و اخلاق اور نظم کی جنگ سمجھتے تھے۔ ان کے الفاظ ہیں

ہم اکثر سوچتے ہیں کہ دشمن کی طاقت بندوق میں ہے، حالانکہ اصل طاقت اس کے نظم میں ہے۔ اگر ہم نے اپنا نظم کھو دیا تو ہماری بندوق بھی بے معنی ہو جائے گی۔

ایک اور اقتباس میں وہ قوم پرستی کو انسانی وقار کی شکل دیتے ہیں۔
ہماری جنگ صرف زمین کے ٹکڑے کے لیئے نہیں بلکہ اس وقار کے لیئے ہے، جو ہماری ماؤں کے آنسوؤں سے چھین لیا گیا ہے۔ یہ جملہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے نزدیک آزادی کی لڑائی مادی نہیں، بلکہ اخلاقی و وجودی لڑائی تھی۔

آخر میں، ان کا وہ قول جو ان کے پورے فکری فلسفے کا خلاصہ ہے۔
انسان جس صحبت میں رہتا ہے، اسی سے تربیت و اثر حاصل کرلیتا ہے۔
یہ فقرہ بظاہر سادہ ہے مگر اس میں پورا انقلابی فلسفہ پوشیدہ ہے۔ قاضی سمجھتے تھے کہ تحریکیں صرف میدانوں میں نہیں بلکہ ماحول، گفتگو اور مطالعے میں بنتی ہیں۔

ان تحریروں سے ایک گہرا اور مربوط تصور سامنے آتا ہے۔ قاضی کے نزدیک مزاحمت وہی ہے جس میں انسان اپنی نفسیات پر قابو پائے، اپنے غم کو نظریہ بنائے، اور اپنے نظریئے کو ادارے میں بدل دے۔ ان کی زبان میں ضبط ہے مگر اس ضبط کے نیچے آتش فشاں جذبات ہیں۔ وہ درد کو خاموشی سے طاقت میں بدلتے ہیں، اور یہی عمل انہیں عام کمانڈر سے ایک مفکر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ باسط زہری یہ سکھاتا ہے کہ بندوق سے زیادہ ضروری وہ عقل ہے جو بندوق کو معنی دیتی ہے۔

کامریڈ مقصود عرف مہروان

کامریڈ مقصود بلوچ ولد احمد 2 مئی 1986 کو ضلع کیچ کے ایک نواحی علاقے ہیرونک میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں سے حاصل کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کوئٹہ منتقل ہوئے، جہاں پولی ٹیکنیکل کالج اور بعد ازاں بلوچستان یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہے۔
طالبِ علمی کے انہی ایام میں وہ سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں شریک ہوئے اور جلد ہی اپنے نظم، اصول پسندی اور خدمت گزاری کے باعث ساتھیوں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔
ابتدا میں ان کی پہچان ایک بااصول، باخبر اور مطالعہ شوق طالبعلم کے طور پر ہوئی، لیکن کچھ ہی عرصے میں وہ تنظیمی حلقوں میں ایک شفیق، ہمدرد اور خدمت گزار شخصیت کے طور پر پہچانے گئے۔

ان کا ہاسٹل کمرہ محض ایک رہائش گاہ نہیں تھا بلکہ ایک غیر رسمی شفاخانہ اور فکری نشست گاہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، جہاں بیماروں کی تیمارداری، تھکے ذہنوں کی دلجوئی اور نئے کارکنوں کی رہنمائی روزمرہ کا معمول تھی۔

اُن کے رفقا ایک واقعہ ہمیشہ یاد کرتے ہیں۔ 2010 میں جب تنظیمی مالیات کی ذمہ داری اُنہیں سونپی گئی اور تقریباً ایک لاکھ روپے پولی ٹیکنیکل کالج زون تک پہنچانے تھے، تو انہوں نے بی ایم سی سے پولی ٹیکنیکل کالج تک پیدل سفر کیا۔ جب ساتھیوں نے وجہ پوچھی تو وہ بولے۔

میں اپنی آسائش و آرام کے لیے تنظیمی و قومی امانت کو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر دورانِ سفر بس میں یہ پیسے چُوری ہو گئے تو اُس نقصان کو بھرنا شاید میرے بس کی بات نہ ہو۔

میں انہوں نے ساتھی تنظیم کے جنگی محاذ سے وابستگی اختیار 2012 کی اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے باعث ایک مثالی کردار بن گئے۔ 2015 میں وہ بلوچ لبریشن آرمی میں شامل ہوئے اور مختلف محاذوں پر اپنی خدمات انجام دیں۔ اُن کے ساتھیوں کا کہنا تھا کہ جہاں کامریڈ مقصود ہوتے، وہاں شکوے کم اور مسکراہٹیں زیادہ ہوتیں۔ انہوں نے جنگ کو محض معرکہ نہیں بلکہ ایک اخلاقی مشق بنا دیا تھا۔

ایک واقعہ اکثر دہرایا جاتا ہے کہ ایک رات چند جنگلی جانور راشن کی جھونپڑی پر حملہ آور ہوئے اور اشیائے خورد و نوش بکھیر گئے۔ صبح جب ساتھی وہاں پہنچے تو دیکھا کہ کامریڈ مقصود خاک میں گرے دال چنوں کو ایک ایک دانہ چن کر تھیلی میں واپس ڈال رہے ہیں۔ ایک ساتھی نے کہا، "ماس، یہ اب ناقابلِ استعمال ہیں، چھوڑ دیں۔" تو وہ مسکرا کر بولے یہ صرف راشن نہیں بلکہ قومی امانت ہیں۔ ہمیں اندازہ نہیں کہ ان کو ہم تک پہنچانے کے لیے تنظیم کتنے مصائب اور مشکلات کا سامنا کرتی ہے۔

ان کی شفقت اور ایثار محض جذباتی اظہار نہیں تھا بلکہ ایک باقاعدہ تنظیمی ذمہ داری تھی۔ وہ ساتھیوں کے لیے ابتدائی طبی امداد کا سامان تیار رکھتے، ادویات کی فہرستیں بناتے، اور موسمی حالات کے مطابق اُنہیں محفوظ رکھنے کے طریقے اپناتے۔ زخمیوں کی تیمارداری میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتے۔

ایک واقعے کے مطابق، ایک رات ایک ساتھی بخار میں مبتلا ہوا تو مقصود فوراً میڈیکل بیگ لے کر پہنچے۔ انہوں نے دوائیں دیں، بستر درست کیا۔

اور اُس وقت تک اُس کے سرہانے بیٹھے رہے جب تک وہ سو نہ گیا۔ پھر وقفے وقفے سے رات بھر اُس کے پاس آہستہ آہستہ جا کر دیکھتے رہے۔ کسی نے پوچھا تو بولے

جب بھی کوئی ساتھی بیمار ہو، میں لاکھ کوشش کے باوجود بھی سو نہیں پاتا کہ کہیں اُسے کسی چیز کی ضرورت ہو۔

اپنے ایثار، خدمت، عاجزی اور شفقت کے باعث کامریڈ مقصود اپنی زندگی ہی میں "ماس" یعنی "ماں" کے لقب سے پکارے جانے لگے۔ یہ محض ایک جذباتی نسبت نہیں بلکہ اُن کے کردار کی پہچان تھی۔ اُنہوں نے طبی خدمت کو ذاتی ہمدردی نہیں بلکہ تنظیمی فریضہ سمجھا۔ ان کی ماں جیسی شفقت نہ صرف ان کے ذاتی اخلاق کا آئینہ تھی بلکہ تحریک کے اندر انسانی اقدار اور اخلاقی شعور کی موجودگی کا مظہر بھی تھی جہاں جنگ اور انسانیت، دونوں ایک ماں کے ہاتھوں میں مرہم کی صورت جمع تھے۔

سمالانی برادران

بلوچ قوم کی مزاحمتی تاریخ کا ایک تابناک باب بولان کے سنگلاخ اور دشوار گزار پہاڑوں میں رقم ہوا، جہاں ترکڑی کے علاقے میں شہید میثدار سمالانی عرف نصیب نے جنم لیا۔ وہ اپنے آبا و اجداد کی روایت کے مطابق گلہ بانی اور کاشتکاری کرتے ہوئے ایک سادہ مگر باوقار زندگی گزارتے رہے۔

شادی کے بعد ان کے دو بیٹے غوث بخش سمالانی عرف طالب اور محمد بخش سمالانی عرف خالد پیدا ہوئے، جنہوں نے کم عمری میں ہی عملی زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور بعد ازاں اپنے والد کے ہمراہ قومی مزاحمتی صفوں میں شامل ہو کر شہادت کے بلند مرتبے پر فائز ہوئے۔

بولان صدیوں سے بلوچ مزاحمت کا مرکز اور سرمچاروں کا پناہ گاہ رہا ہے۔ 2016ء میں جب قابض پاکستانی فوج نے شہید استاد اسلم اور ساتھیوں کے خلاف بڑے پیمانے پر آپریشن کیا تو شکست کے بعد عام بلوچ گلہ بانوں پر ظلم و ستم ڈھایا گیا۔ ترکڑی سمیت متعدد علاقوں میں گھروں کو نذرِ آتش کیا گیا، مویشی لوٹے گئے اور معصوم چرواہوں کو بے دردی سے شہید کیا گیا۔ انہی مظلوم خاندانوں میں شہید میثدار سمالانی کا گھرانہ بھی شامل تھا۔ انہیں دھمکیاں دی گئیں کہ وہ اپنی زمین چھوڑ دیں، مگر انہوں نے اپنے آبا و اجداد کی سرزمین سے انخلا سے انکار کرتے ہوئے غیر متزلزل عزم کا مظاہرہ کیا۔

فوجی جبر کے تسلسل کے دوران 2019ء میں میشدار سمالانی اپنے بیٹوں کے ہمراہ باقاعدہ طور پر بلوچ مزاحمتی تحریک میں شامل ہوئے۔ میشدار نرم گفتار، باوقار اور منکسر المزاج شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بولان کے محاذ پر بہادری سے لڑتے رہے یہاں تک کہ 31 اکتوبر 2022ء کو بولان و ہرنائی کے درمیانی علاقے میں ایک بڑے فوجی آپریشن کے دوران اپنے ساتھیوں درمحمد سمالانی عرف روستو اور خیر بخش سمالانی عرف فرید کے ہمراہ کئی گھنٹوں تک مقابلہ کیا۔ انہوں نے پندرہ سے زائد فوجی اہلکاروں اور ایس ایس جی کمانڈوز کو ہلاک کیا اور آخرکار "آخری گولی" کے فلسفے پر عمل کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔

والد کی شہادت نے دونوں بیٹوں کے حوصلے اور عزم کو مزید جِلا بخشی۔ فدائی غوث بخش سمالانی عرف طالب نے 2022ء میں بی ایل اے مجید بریگیڈ میں شمولیت اختیار کی اور آپریشن درہ بولان سمیت کئی معرکوں میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کے بھائی محمد بخش سمالانی عرف خالد نے بھی 2023ء میں مجید بریگیڈ میں شمولیت اختیار کی اور آپریشن "ہیروف" کے لیے منتخب ہوئے۔ تاہم آپریشن کی تکمیل سے قبل، 19 اگست 2024ء کو مستونگ کے مقام پر دورانِ سفر ایک طویل جھڑپ میں انہوں نے سات فوجی اہلکاروں کو ہلاک کرنے کے بعد جامِ شہادت نوش کیا۔

بھائی کی شہادت کے باوجود طالب نے حوصلہ نہ ہارا۔ انہوں نے آپریشن "ہیروف" کی قیادت سنبھالی اور بیلہ کیمپ پر حملے کے دوران زخمی ہونے کے باوجود لڑائی جاری رکھی۔ جب ساتھیوں نے انہیں "آخری گولی" کے فلسفے پر عمل کی اجازت دی تو انہوں نے کہا:

"میں بہ حیثیت آپریشنل کمانڈر اپنے ساتھیوں کو زخمی حالت میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے بعد کچھ بھی ہو، میں آخر دم تک لڑوں گا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہادت کو قبول کروں گا۔"

یوں شہید میشدار سمالانی اور ان کے بیٹوں کی قربانیاں بلوچ تاریخ میں عزم، وفا اور فکری تسلسل کی علامت بن گئیں۔ ان کی داستان اس بات کا عملی ثبوت ہے کہ قومی شعور، ایثار اور قربانی نسل در نسل منتقل ہو کر ایک ایسی روایت کو جنم دیتے ہیں جو مزاحمت کے استعارے کے طور پر ہمیشہ زندہ رہے گی۔

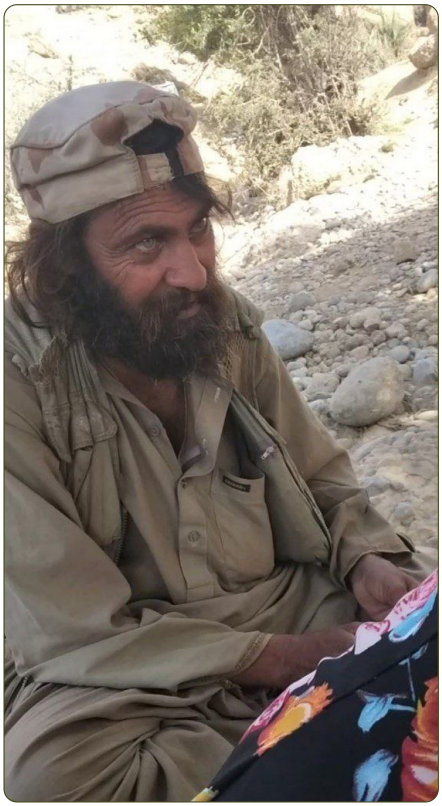

فدائی رشید بزدار عرف میرل

بلوچستان کی مزاحمتی ورثے اور حسن و لطافت کی تاریخی سرزمین، کوہِ سلیمان کے علاقے ڈیرہ غازی کے چھوٹے سے کالونی اللہ آباد میں فدائی رشید بُزدار عرف میرل 2 اکتوبر 2004 کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم ڈی جی خان کے اسکول دہوم سے حاصل کی اور بعد ازاں بوائز کالج ڈیرہ غازی خان سے انٹرمیڈیٹ مکمل کیا۔ کمپیوٹر سائنس کی تعلیم حاصل کرنے والے رشید بچپن سے ہی سیاسی فکر و نظریات سے جُڑے اور بیشتر اوقات کتابوں کے مطالعے میں مگن رہتے۔ سیاسی مجالس اور مباحثوں میں خاموشی سے بیٹھ کر سننے والے رشید اُس مزاحمتی تاریخ کے ورثے سے روشناس ہوئے، جسے جبراً فرضی لکیروں سے چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔

دورانِ اسکول، انہوں نے سیاسی سرکلز، مباحث اور سرگرمیوں میں حصہ لیا اور ڈیرہ غازی خان کے مختلف قبائل کی جانب سے انگریزوں، سکھوں اور دیگر قابضین کے خلاف تاریخی جنگوں کے واقعات سے آگاہ ہوئے۔ انگریزوں کی سفاکیت، ٹیکس اور باجگزاری کے خلاف مزاحمت اور دسمبر 1967 میں جنرل ایوب خان کے خلاف قبائل کی جنگ و شہادت کے واقعات ان کے ذہن میں نقش ہوگئے۔

رفتہ رفتہ رشید بُزدار اس نتیجے پر پہنچے کہ مسئلے کا حل مسلح جدوجہد ہے اور تشدد کو عدم تشدد یا سیاسی للکار سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی سوچ کے تحت انہوں نے نرسنگ کا کورس کیا اور 2022 میں پہاڑوں کو مسکن بنا کر مسلح جدوجہد کا آغاز کیا، اور اپنے خدمات مجید بر گیڈ کے سپرد کیں۔ قبل از مزاحمت، وہ دوستوں کو کہتے کہ

شعور کو بیدار کرنے کیلئے آواز کی للکار نہیں بلکہ بندوق کی گولی ضروری ہے۔ مزاحمت وہ واحد راستہ ہے جو تاریخی ورثے کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔

قابض ریاست کی جانب سے ڈیرہ غازی خان کے قدرتی وسائل کی لوٹ مار، کوہِ سلیمان کے بلوچوں کی ناداری، مفلسی اور یورینیم نکالنے کے بعد پیدا ہونے والی مہلک بیماریاں رشید کے فکری اور سیاسی تجزیے کا حصہ تھیں۔ وہ کہتے تھے کہ قابض فوج میں بھرتی ریاستی تشدد میں اضافہ کرتی ہے، لیکن تاریخی مزاحمتی ورثے کو اپنا مقصد بنانا ہی حل ہے۔

مزاحمتی سفر میں وہ خاموشی سے معاملات کا جائزہ لیتے اور اپنی سکوت میں ہزار دلائل جمع کرتے۔ ساتھی سرمچار کہتے ہیں کہ رشید اکثر یہ درس دیتا تھا کہ "جدوجہد میں برداشت، صبر اور حاضر دماغی لازمی ہے۔ شعور کا چشمہ کتابیں ہیں۔ ایک ہمسفر کے مطابق، رشید نے کہا

میری قربانی کے بعد لوگ مزاحمت کو اپنا اولین ہتھیار بنائیں گے اور فرضی لکیریں ہمیں قومی ورثے سے جدا نہیں کر سکتیں۔ بلوچ قوم اپنی ناداری اور مفلسی کا حل ریاست کی غلامی میں نہیں بلکہ جنگ کے ذریعے تلاش کرے گی۔

فدائی رشید بُزدار کی قربانی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ جبراً کھینچی گئی لکیریں، انتظامی تسلط اور معاشی پسماندگی اُس مزاحمتی شعور کو ختم نہیں کر سکتے جو بلوچ قوم کی رگوں میں دوڑتا ہے۔

سینئر کمانڈر ملک خان محمد مری

ملک خان محمد مری، ضلع سبی کے علاقے بادرہ کے رہائشی، ایک ایسے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جو نسل در نسل قومی مزاحمت کا استعارہ رہا ہے۔ اُن کے والد کا نام میرو خان مری تھا جبکہ اُن کے دادا، جانی خان مری، انگریز سامراج کے خلاف ہڑپ کے مقام پر لڑتے ہوئے شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے۔ یہ خاندانی اور مزاحمتی ورثہ اُن کی فکری اور عملی تربیت کا اہم جُزو تھا جس کے سائے تلے وہ آخرِ وقت تک مزاحمت سے دستبردار نہ ہوئے۔ اُن کی پیدائش تقریباً 1940 کی دہائی میں ہوئی۔

1958 کی مزاحمت کے دوران وہ نواب نوروز خان کے قریبی ساتھیوں میں شامل تھے اور عملی طور پر اس تحریک میں حصہ لیا۔ بعد ازاں 1973 کی تحریکِ آزادی کے موقع پر جب ذوالفقار علی بھٹو نے بلوچستان میں فوجی کارروائیوں کا حکم دیا تو ملک خان محمد مری کے خاندان کے متعدد افراد نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ وہ شہید کمانڈر سفر خان کی قیادت میں بولان کے علاقے بُزگر میں مزاحمتی محاذ کا حصہ رہے۔ اُن کے قریبی رشتہ دار، شہید شاہ بیگ مری، گل بیگ اور دیگر نو افراد اس جنگ میں شہید ہوئے۔ ان حالات کے باعث اُن کا خاندان دیگر بلوچ قبائل کے ساتھ افغانستان ہجرت پر مجبور ہوا۔

افغانستان میں 1980 کی دہائی کے دوران مہاجرت کی زندگی بے حد دشوار تھی، لیکن وہ نواب خیر بخش مری کے قریبی رفیق بنے رہے۔ وہ میر محمد علی تالپور، شہید فدا احمد اور دیگر سیاسی جہدکاروں کے ساتھ فکری و سیاسی نشستوں میں شریک رہتے، تاکہ قومی آزادی کی تحریک کو ازسرِنو فعال کیا جا سکے۔ انیس سو نوے کی دہائی کے آغاز میں وہ وطن واپس لوٹے۔ نواب خیر بخش مری نے اُنہیں پیغام دیا کہ خفیہ طور پر جنگی تیاریوں کا آغاز کیا جائے۔ چنانچہ خفیہ میٹنگز اور تنظیمی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلا کیمپ چمالنگ میں قائم کیا گیا، جو ابتدائی طور پر جان محمد مری کی قیادت میں تھا، بعد ازاں یہ ذمہ داری ملک خان محمد مری نے سنبھالی۔ دوسرا کیمپ ناگاہو میں قائم کیا گیا۔ سے 1994 کے دوران کاہان کے علاقے کرمو کے قریب مزئی 1992 آپ اور گلگئی میں تین اہم میٹنگز ہوئیں جن میں ملک خان محمد مری شریک تھے۔ انہی برسوں میں انہوں نے تپڑ کے مقام پر اپنے فرزند اور بھتیجے کو کیمپ کی ذمہ داری سونپی، جو دو برس تک خفیہ طور پر فعال رہا۔

دوہزار کی دہائی میں جب مسلح جدوجہد منظرِ عام پر آئی، تو بادرہ، بیجمئی اور ناگاہو کے علاقوں میں اُن کے اپنے خاندان کے افراد عملی طور پر سرگرم تھے۔ وہ مالی معاونت کے ساتھ ساتھ ہر چند ماہ بعد اوتاک جا کر ساتھی سرمچاروں کی ضروریات اور حالات سے براہِ راست آگاہی حاصل کرتے۔ دو ہزار پانچ میں شہید بالاچ مری نے اُنہیں پیغام دیا کہ بولان اور قریبی علاقوں میں استاد اسلم کی مدد سے تنظیم کو فعال کیا جائے۔ ملک خان محمد مری نے اپنے اثرورسوخ والے علاقوں میں استاد اسلم کی بھرپور حمایت کی اور اپنے دو بیٹوں سمیت کئی عزیزوں کو تحریک میں شامل کیا۔ اُن کے فرزند ظفر خان مری حالیہ تحریک میں شہید ہوئے، جبکہ خاندان کے درجنوں افراد نے جامِ شہادت نوش کیا۔

جب 2017 میں جب استاد اسلم نے بی ایل اے کی تنظیمِ نو کی، تو ملک خان محمد مری اُن کمانڈروں میں شامل تھے جنہوں نے قبائلی مفادات کو ترک کر کے شعوری طور پر قومی تحریک کے ساتھ وابستگی اختیار کی۔ وہ تنظیم کے ابتدائی ڈھانچے کی تشکیل اور داخلی استحکام میں کلیدی کردار ادا کرتے رہے۔ اپنی رحلت تک اُنہوں نے مزاحمت، اصول پسندی اور فکری ورثے کی حفاظت کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

اُن کا یہ قول آج بھی ان کے ساتھی دہراتے ہیں

تہتر کی جنگ میں جب ذوالفقار علی بھٹو نے حکم دیا کہ مری قبیلے کے لوگوں کے گھر جلائے جائیں اور اُن کے مال مویشی چھین لیے جائیں، اُنہیں علاقہ بدر کیا جائے تاکہ وہ معاشی تنگ دستی، دربدری کی وجہ سے مزاحمتی کیلئے ناقابل رہیں، لیکن وہ یہ بات بھول چکا تھا کہ ہم بلوچ ہیں اور ہم جہاں بھی ہوں، اپنے سرزمین کی آزادی کی خاطر کسی بھی قسم کے مصائب سے شکست فاش نہیں ہو سکتے اور سرزمین کے کسی بھی کونے میں بسیرا کر کے اپنی مزاحمت جاری رکھ سکتے ہیں۔

ملک خان محمد مری کی زندگی استقامت، وفاداری اور قومی شعور کی مثال تھی۔ اُن کا کردار آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسا درس ہے جو مزاحمتی ورثے کو زندہ رکھنے اور آزادی کی جدوجہد کو حتمی منزل تک پہنچانے کا عزم پیدا کرتا ہے۔

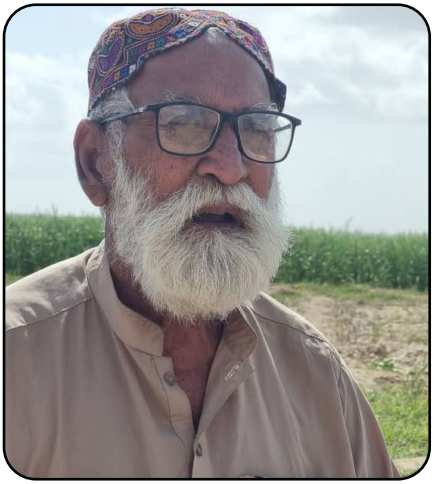

نشرواشاعت

ہکّل پبلیکشنز